پرتو روہیلہ

غالبؔ کی زندگی کے تین اہم فیصلے

غالبؔ کی زندگی پیدائش سے لے کر ان کی موت تک ہنگاموں سے لبریز رہی۔ قدم قدم پر وہ ایسے شدید حالات سے دوچار ہوئے جہاں انہیں سلیم الطبعی کے اظہار کے ساتھ قوت فیصلہ کے استعمال کی بھی شدید ضرورت ہوتی۔ سو اگر ان کی پُرآشوب زندگی کا احاطہ کیا جائے تو ایسے مواقع ہزاروں نہیں تو سیکڑوں ضرور ہوں گے جو ان کے لیے بہت اہم تھے۔ اب اگر سیکڑوں اہم واقعات سے اہم ترین منتخب کیے جائیں تو میری نظر میں وہ صرف تین بنتے ہیں اور وہ اس لیے نہیں کہ ان سے مقابل ہو کر غالبؔ نے انتہائی ہوشیاری اور سلیم الطبعی کا اظہار کیا بلکہ اس لیے کہ اس وقت کے حالات سے دوچار ہو کر غالبؔ نے جو فیصلے کیے وہ اتنے اہم، اثرانگیز اور دوررس تھے کہ انہوں نے نہ صرف غالبؔ کی زندگی کا رخ بدل دیا بلکہ اردو ادب کی تاریخ پر بھی نہ مٹنے والے نقوش مرتسم کر دیے۔ ان اہم ترین فیصلوں میں سب سے وقیع فیصلہ اسلوب بیدلؔ کو ترک کر کے آسان گوئی کا فیصلہ ہے۔ دوسرا فیصلہ وہ ہے جو انہوں نے کلکتے جاتے ہوئے لکھنؤ کے قیام کے دوران آغا میر سے ملاقات کے لیے اپنی چند شرائط پیش کر کے کیا اور تیسرا فیصلہ وہ ہے جو انہوں نے دہلی کالج کی مدرسی سے انکار کی صورت میں کیا۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں فیصلوں میں پہلا فیصلہ تو خالصتاً ادبی ہے یعنی جس کا تعلق غالبؔ کی ادبی شخصیت اور ان کی ادبی اقدار سے ہے جب کہ باقی دونوں فیصلے غالبؔ کی معاش سے تعلق رکھتے ہیں اور اگرچہ فیصلوں کی اپنی بنیاد سماجی اور اخلاقی اقدار پر کیوں نہ ہو ان کے نتائج لازماً معاشی تھے۔ زیرنظر مضمون میں ان عوامل پر ہی بات ہوگی جو ان تینوں فیصلوں کا باعث ہوئے۔

عبدالصمد (ہرمزد) کا غالبؔ کی زندگی میں ورود ایک اتفاق بلکہ حسنِ اتفاق سہی

Scanned by CamScanner

لیکن دس گیارہ سال کی عمر میں ان کا شاعری کی طرف میلان اور پھر ظہوریؔ اور بیدلؔ جیسے فارسی شعرا کی طرف رغبت تو لازمی ان کے فطری رجحانات تھے جن سے خود ان کے کوئی مفر نہیں تھا۔اس لیے جب غالبؔ ''مبداء فیاض'' کی بات کرتے ہیں تو غلط نہیں کہتے۔ ورنہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ عبدالصمد کے زیر اثر انہوں نے آگرے ہی میں فارسی شاعری بھی شروع کر دی ہوتی۔ جب کہ فارسی شاعری پر انہوں نے تقریباً کلکتے کے سفر کے دوران زور دیا۔ سو کلکتے کے قیام کے دوران سراج الدین احمد کے ایما پر جب انہوں نے ''گل رعنا'' کا انتخاب کیا اور اپنے اردو کلام سے دو ثلث نکال کر ڈالے تو یہ اس دیوان سے تھا جو سفر کلکتہ سے پہلے مرتب ہو چکا تھا۔

گل رعنا کے دیباچۂ ریختہ میں غالبؔ بڑے شدومد سے تحریر فرماتے ہیں:

> ''نگارندۂ ایں نامہ را آں درسراست کہ پس از انتخاب دیوان ریختہ بگرد آوردن سرمایۂ دیوان فارسی برخیزد و باسفادۂ کمال ایں فریو دفن پس زانوئے خویشتن نشیند۔ امید کہ سخن سرایانِ سخنور ستائی پراگندہ ابیاتی را کہ خارج ازیں اوراق یا بند، از آثار تراوشِ رگ کلک ایں نامہ سیاہ نشناسند و چامۂ گرد آور را درستایش ونکوہش آن اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند یا رب این بوی ہستی نا شنیدہ از نیستی بہ پیدائی نارسیدہ یعنی نقشِ بضمیر آمدۂ نقاش کہ بہ اسداللہ خان موسوم و بہ مرزا نوشہ معروف و بہ غالبؔ متخلص است چنانکہ اکبرآبادی مولد و دہلوی مسکن است فرجام کار نجفی مدفن نیز باد۔'' (۱)

یہاں غالبؔ یہ نہیں بتاتے کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں یعنی اپنا دو تہائی اردو کلام نظری کر دینے کا سبب کیا ہے۔ البتہ وہ دیباچۂ ''گل رعنا'' میں اتنا ضرور فرماتے ہیں:

> ''میں نے اردو گوئی میں بھی وہی طریقہ روا رکھا ہے جو فارسی میں روا رکھا تھا۔ میری شاعری کے دو دروازے ہیں۔ ایک اردو اور ایک

Scanned by CamScanner

نتالیا پری گاما اپنی مشہور تصنیف غالب میں تحریر کرتی ہیں: ''بہت سوں کا خیال ہے کہ اگر فضل حق نہ ہوتے تو غالبؔ کے حق میں میرؔ کی یہ پیش گوئی کہ کامل استاد نہ ملنے کی صورت میں یہ لڑکا مہمل بکنے لگے گا سچی ثابت ہوتی۔ غالبؔ کے اسلوب کے تعلق سے ایسی سخت گیری کا مظاہرہ کرنے میں فضل حق اکیلے نہیں تھے۔ آزردہ جیسے سخن سنج اور سادگی کے شیدا نے بھی غالبؔ کو اظہارِ خیال کے دوسرے وسائل کی تلاش کی ترغیب دی۔ ان کے اثر سے نہ صرف اسلوب شاعری میں بلکہ شاعر کے مزاج میں بھی سلامت روی پیدا ہوئی۔ ظ۔ انصاری تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ زرتشتی عبدالصمد کو نہیں بلکہ فضل حق، آزردہ اور شیفتہ کو غالبؔ کا استاد سمجھنا چاہیے۔''(۵)

طعن وتعریض اور ہمعصروں کی خردہ گیری کے ضمن میں ایک لطیفہ بہت دہرایا گیا ہے جس کو حالیؔ نے مولوی عبدالقادر رامپوری کی زبانی جبکہ پون ورما نے (غالب، شخصیت اور عہد) آغا جان عیش کی زبانی بتایا ہے۔ حالیؔ کی زبانی یہ لطیفہ اس طرح ہے:

''ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے اور جن کو قلعہ دہلی سے تعلق رہا تھا مرزا سے کسی موقع پر کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا اور اسی وقت دو مصرعے موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے:

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں۔ مولوی عبدالقادر نے ازراہِ مزاح کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمہارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔''(۶)

Scanned by CamScanner

رستے پر پڑ لیے تھے کہ اگر استقامت طبع اور سلامت ذہن اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک اور نکتہ چیں ہمعصروں کی خردہ گیری اور طعن و تعریض سدِ راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے بہت دور جا پڑتے۔ سنا گیا ہے کہ اہل دہلی مشاعروں میں جہاں مرزا بھی ہوتے تھے تعریضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پر شوکت و شاندار معلوم ہوتی تھیں مگر معنی ندارد۔ گویا مرزا پر ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔''(۴)

گویا حالؔی نے اس ضمن میں تین بڑے عوامل کی نشاندہی کی ہے۔ اول استقامت طبع و سلامت ذہن، دوم صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک، سوم نکتہ چیں ہم عصروں کی خردہ گیری و تعریض۔

اکثر سوانح نگاروں نے ان تینوں عوامل کا ذکر کیا ہے۔ صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک کے ضمن میں حالؔی کہتے ہیں: ''جب مولوی فضل حق سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا ان کو اپنا خالص و مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو انہوں نے اس قسم کے اشعار پر روک ٹوک کرنی شروع کی۔ یہاں تک کہ انہیں کی تحریک سے انہوں نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا اور پھر اس کے بعد اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔'' بظاہر حالؔی کی نظر میں ان صحیح المذاق لوگوں میں صرف یا خصوصاً مولوی فضل حق ہی تھے جن کے ایما پر غالبؔ نے اپنی پرانی روش ترک کی۔ ذکرِ غالبؔ میں مالک رام صاحب نے بھی صرف مولوی فضل حق ہی کا ذکر کیا ہے۔ اردو میں وہ اپنی بیدلانہ طرز مولوی فضل حق کی روک ٹوک پر کلکتہ جانے سے پہلے ہی ترک کر چکے تھے (ص ۱۶۰)۔ لیکن دوسرے سوانح نگار مولوی فضل حق کے ساتھ آزردہ اور شیفتہ کو بھی شامل کرتے ہیں۔ شامل ہی نہیں کرتے بلکہ برابر کا شریک تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ

Scanned by CamScanner

نتالیا پری گاما اپنی مشہور تصنیف غالب میں تحریر کرتی ہیں: ''بہت سوں کا خیال ہے کہ اگر فضل حق نہ ہوتے تو غالبؔ کے حق میں میرؔ کی یہ پیش گوئی کہ کامل استاد نہ ملنے کی صورت میں یہ لڑکا مہمل بکنے لگے گا سچی ثابت ہوتی۔ غالبؔ کے اسلوب کے تعلق سے ایسی سخت گیری کا مظاہرہ کرنے میں فضل حق اکیلے نہیں تھے۔ آزردہ جیسے سخن سنج اور سادگی کے شیدا نے بھی غالبؔ کو اظہارِ خیال کے دوسرے وسائل کی تلاش کی ترغیب دی۔ ان کے اثر سے نہ صرف اسلوب شاعری میں بلکہ شاعر کے مزاج میں بھی سلامت روی پیدا ہوئی۔ ظ۔انصاری تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ زرتشتی عبدالصمد کو نہیں بلکہ فضل حق، آزردہ اور شیفتہ کو غالبؔ کا استاد سمجھنا چاہیے۔''(۵)

طعن وتعریض اور ہمعصروں کی خردہ گیری کے ضمن میں ایک لطیفہ بہت دہرایا گیا ہے جس کو حالیؔ نے مولوی عبدالقادر رامپوری کی زبانی جبکہ پون ورما نے (غالب،شخصیت اور عہد) آغا جان عیش کی زبانی بتایا ہے۔ حالیؔ کی زبانی یہ لطیفہ اس طرح ہے:

''ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے اور جن کو قلعہ دہلی سے تعلق رہا تھا مرزا سے کسی موقع پر کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا اور اسی وقت دو مصرعے موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے:

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں۔ مولوی عبدالقادر نے ازراہِ مزاح کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمہارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔''(۶)

Scanned by CamScanner

ظاہر ہے غالبؔ کے کلام میں وہ سارے اشعار جو انہوں نے اخفائے حال، ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا نہ ہونے یا گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کی ضمن میں کہے ہیں وہ درحقیقت اس ہم عصری خردہ گیری اور طنز و تعریض کے جواب میں دفاعاً ہی کہے گئے ہیں اور اس کی شدت کی تصدیق کرتے ہیں۔

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ہوتے ہیں ملول اس کو سن کے جاہل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

رہی بات استقامت طبع اور سلامت ذہن کی تو اس کا چونکہ غالبؔ کی شخصیت سے براہِ راست تعلق ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان عوامل پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے جنہوں نے غالبؔ کی شخصیت کی تعمیر میں مدد کی۔

میرزا غالبؔ کی پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء آگرے میں ہوئی۔ ان کا پورا نام اسداللہ بیگ خان تھا۔ ان کے والد کا عرف میرزا دولھا تھا ان کا مرزا نوشہ ہوا۔ ان کے دادا قوقان بیگ خان سمرقند سے جب ہندوستان آئے تو پہلے لاہور میں نواب معین الملک (میر منّو) کے ہاں ملازم ہوئے۔ میر منّو کی وفات پر وہ دلّی پہونچے اور نواب ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خان کی سرکار سے وابستہ ہوئے اور ان کے توسل سے شاہ عالم کی سرکار میں پچاس گھوڑے، نقارے اور نشان پر ملازم ہوئے اور وہاں سے مغلیہ سلطنت کی ملازمت ترک کر کے مہاراجہ جے پور کے دربار سے وابستہ ہوئے اور دلّی سے آگرہ چلے گئے۔

میرزا غالبؔ کے والد عبداللہ بیگ خان کی ولادت دلّی میں ہوئی۔ قوقان بیگ

Scanned by CamScanner

خان کی موت کے بعد عبداللہ بیگ خان لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے ملازم رہے۔ وہاں سے حیدرآباد میں نواب نظام علی خان کی ملازمت اختیار کی اور وہاں کی خانہ جنگی سے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ وہاں راجہ راؤ بختاور سنگھ سے وابستہ رہے اور وہیں زمینداروں کی ایک مقامی لڑائی میں مارے گئے۔ عبداللہ بیگ خان کی شادی میرزا غلام حسین خان کمیدان کی لڑکی عزت النساء بیگم سے ہوئی۔ خواجہ غلام حسین خان کمیدان سرکار میرٹھ کے ایک فوجی افسر اور آگرے کے عمائدین میں سے تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خان اپنی سسرال میں مرزا دولھا کے نام سے مشہور تھے اور خانہ داماد تھے۔ ان کا اپنا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ان کی وفات پر راجہ بختاور سنگھ رئیس الورے ''دو گاؤں سیر حاصل اور کچھ روزینہ'' میرزا مرحوم کے لڑکوں کی پرورش کے لیے مقرر کر دیا جو ایک مدت تک جاری رہا۔ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کب اور کیوں بند کر دیا گیا۔

میرزا عبداللہ خان بیگ کی وفات کے بعد ان کے بچوں کی سرپرستی اور دیکھ بھال ان کے چچا نصراللہ بیگ خان نے کی۔ نصراللہ بیگ خان کی شادی فخرالدولہ، دلاور الملک احمد بخش خان والیٔ لوہارو کی بہن سے ہوئی۔ لیکن ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اور پھر جلد ہی ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ چنانچہ غالبؔ اور ان کے بہن بھائیوں کا سہارا صرف نصراللہ خان ہی رہ گئے۔ نصراللہ بیگ خان انگریزوں کی عملداری سے پہلے مرہٹوں کی طرف سے فرانسیسی جنرل Perron کی ماتحتی میں اکبرآباد کے حاکم تھے۔ ۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک نے اس علاقے پر چڑھائی کی تو مرزا نصراللہ بیگ خان نے اغلباً نواب احمد بخش خان کی ایما پر بغیر دفاع کے ہتھیار ڈال دیے اور شہر لارڈ لیک کے حوالے کر دیا۔ جس خدمت کے عوض ان کو انگریزی سرکار میں چار سو سوار کا رسالدار بنا دیا گیا اور سترہ سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا۔ اور اس کے بعد میرزا نے خود سونک اور سونسا، لاکھ سوا لاکھ آمدنی کے دو زرخیز پرگنے جو بھرت پور کے نواح میں تھے ریاست ہلکر کے سپاہیوں سے چھین لیے۔ جنرل لیک نے سابقہ خدمات کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ دونوں پرگنے بھی ان کو تاحین حیات ان

Scanned by CamScanner

کی جاگیر میں دے دیے۔ نصراللہ خان اچانک ہاتھی سے گر کر ۱۸۰۶ء میں وفات پا گئے۔
اس وقت میرزا غالبؔ کی عمر آٹھ برس اور چند ماہ تھی۔

نصراللہ بیگ خان کی وفات پر ان کی حین حیات جاگیر سونک اور سانسا انگریزوں نے واپس لے لی اور رسالہ بھی توڑ دیا۔ البتہ یہ طے پایا کہ نواب احمد بخش خاں پچاس سواروں کا ایک دستہ برقرار رکھیں گے۔ اس دستے کے اخراجات اور نصراللہ خان کے پسماندگان کی پنشن کے لیے ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو یہ حکم صادر ہوا کہ نواب احمد بخش خان اپنی جاگیر کے لیے جو پچیس ہزار روپیہ سالانہ دیتے ہین وہ اس شرط پر معاف کیے جاتے ہیں کہ آئندہ اس کے پندرہ ہزار وہ اس دستے کی غور و پرداخت پر خرچ کریں گے اور باقی دس ہزار میرزا مرحوم کے خاندان کو بطور پنشن ادا کریں گے۔ لیکن نہ جانے کیسے اس فیصلے کے ایک ماہ بعد ہی ۷ جون ۱۸۰۶ء کو احمد بخش خان نے لارڈ لیک سے ایک خط حاصل کر لیا جس میں درج تھا کہ میرزا نصراللہ بیگ خان کے متعلقین کو پانچ ہزار روپیہ سالانہ حسب ذیل تفصیل سے ادا کیا جائے گا:

۱۔ خواجہ حاجی۔ دو ہزار روپیہ سالانہ ۲۔ میرزا نصراللہ بیگ خان کی والدہ اور تین بہنیں۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ ۳۔ میرزا نوشہ اور مرزا یوسف برادرزادگان میرزا نصراللہ بیگ خان مرحوم۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ۔ گویا پہلے دس ہزار کے پانچ ہزار ہوئے اور ان پانچ ہزار میں بھی خواجہ حاجی کو مرزا نصراللہ خان کے یا عبداللہ خان کے پس ماندگان میں شامل کر کے دو ہزار سالانہ کا حقدار بنا دیا۔ خواجہ حاجی کی اس پنشن میں شمولیت ہی اس مقدمے کی بنیاد تھی جس کے لیے غالبؔ کلکتہ بھی گئے اور ناکام ہونے پر ملکہ وکٹوریہ کے دربار میں بھی عریضہ گزار ہوئے لیکن کامیابی میسر نہ ہوئی۔

یہ چند حقائق کا ایک مختصر سا خاکہ ہے جو اکثر ''ذکرِ غالب'' سے لیے گئے ہیں اور غالب کے خاندانی ماحول اور ان کی تربیت و ذہنی نشوونما کا پس منظر پیش کرتے ہیں۔ ان حقائق سے جو امور ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ خاندان ان طالع آزما فوجی

Scanned by CamScanner

خدمت گاروں کا تھا جو توکل بخدا ہندوستان کی وسعتوں میں اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتیں لے کر پہونچا تھا اور زندگی کے تقاضوں کے تحت جہاں کہیں بھی دوچار آسودگی کے لمحات کا امکان نظر آیا اپنی کمر کھول دیتا تھا۔ چونکہ اولاً ان کے اپنے آگے پیچھے اقامتی زندگی کی پابندیاں اور قبائلی و اجتماعی رشتوں کی قیود و تقاضے نہیں تھے اس لیے وہ ان ساری اقدار سے وقتی طور پر آزاد تھے جو اخلاقیات کے ضمن میں آتی ہیں۔ چنانچہ وفاداری، دیانت، ایفائے عہد، راستی، حق شناسی جیسی ساری اقدار نہ اس ماحول میں موجود تھیں اور نہ ہی ان کا اسلوب حیات ان اقدار کے تعیش کا متحمل ہوسکتا تھا۔ اس ماحول کی سب سے اہم، متحرک اور کارآمد قدر، ہوشیاری، موقع شناسی اور حیات پرستی تھی۔ ہر وہ عمل کہ رشتۂ حیات برقرار رکھے جائز تھا اور ہر وہ حرکت جو پانی سے سر باہر رکھنے میں مد ہو مباح تھی۔

لیکن یہ تو خاندان کی اور ماحول کی اجتماعی صورت حال تھی۔ انفرادی طور پر دیکھا جائے تو غالب کے دادا کا بھی کوئی ٹھور ٹھکانا نہ تھا۔ ان کے حالات میں شاید ہو بھی نہیں سکتا تھا لیکن جب ان کے والد بھی بہ حیثیت خانہ داماد ہی مرے، تو یہ صورت حال قدرے غیر معمولی تھی۔ غالبؔ ننھیال ہی میں رہے جو اس وقت خاصی متمول شمار کی جاتی تھی۔ ماحول خالص جاگیردارانہ تھا۔ روک ٹوک کے لیے نہ باپ، نہ چچا نہ بڑا بھائی۔ ننہال کے قریبی عزیزوں میں ماموں کا ہی سراغ نہیں ملتا ہے تو نانا تو پھر دور کی بات ہے۔ ابھرتی ہوئی جوانی، صورت شکل، قد و قامت، اس پر مستزاد تموّل کے پس منظر اور شاعر کی افتاد طبع نے اور بھی گل کھلائے۔ غرض:

ہموارہ ذوق مستی و لہو و سرود و سوز　　　پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار

غالبؔ نے بھی صورت حال سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لیکن ان کے یہ اللّے تللّے بہت عرصے نہیں چلے تھے کہ زمینی حقائق نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ ان زمینی حقائق میں ایک تلخ حقیقت تو ان کے والد کی خانہ دامادی سے پیدا ہونے والی صورت حال تھی جس نے ان کی خوشی میں زہر گھول دیا تھا اور ان کو اس عزت و وقار

Scanned by CamScanner

سے محروم رکھا تھا جو عام حالات میں کسی شخص کو اپنے باپ کے گھر میسر ہوتا ہے۔ دوسری ان کی معیشت کی غیر مطمئن صورت حال تھی جس نے ان کی نفسیات پر اثر ڈالا۔ صاحب آثار غالب نے اس جگہ ایک بڑا معقول سوال اٹھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''یہ ایک معمہ ہے کہ اگر مرزا کی ننھیال اس قدر خوشحال تھی اور وہاں انہیں ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا تو انہیں آگرہ چھوڑنے اور نواب احمد بخش یا کسی پھوپھی کا دست نگر ہو کر دہلی جانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز یہ امر ہے کہ اگرچہ جب مرزا شروع شروع میں دہلی گئے ہیں تو ماں انہیں آگرے سے کبھی کبھار کچھ بھیج دیا کرتی تھیں لیکن اس کے بعد مرزا پر سخت سے سخت مصیبتیں آئیں، ان کا بھائی دیوانہ ہو گیا، قرض خواہوں نے ان کی زندگی اجیرن کر دی، قمار بازی کی وجہ سے انہیں جیل جانا پڑا، غرضیکہ ان پر مصیبتوں اور رنج والم کے پہاڑ ٹوٹے لیکن ان کے خطوں میں اس امر کا کوئی نشان نہیں کہ ان کی ننھیال میں سے کسی نے آ کر ان کی خبر بھی پوچھی ہو..... کیا اس تمام صورت حال سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا ہو گا کہ مرزا کے لیے ننھیال میں فقط خوشی اور بے فکری نہ تھی، کلفتیں اور باطنی کشمکش بھی تھی۔'' (۷)

غرض ان حقائق کو نظر میں رکھا جائے تو مرزا کی نشوونما اور حالاتِ زندگی میں (احساس کمتری) کے نفسیاتی اصول کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ ایک شاندار ماحول میں پیدا ہوئے اور پلے لیکن اس ماحول کے مقابلے میں انہیں اپنی کمزوری اور کوتاہیوں کا احساس تھا۔ خدا نے ہمت بلند دی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ ان کوتاہیوں کی تلافی کی جائے۔ انہوں نے مادی ترقیوں کے لیے فضا کو ناسازگار سمجھ کر ادھر سے آنکھیں بند کیں۔ بزرگوں نے جو میراث چھوڑی تھی اس پر قناعت کی اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے شعروسخن کا

Scanned by CamScanner

راستہ چنا۔ تاکہ اس میں اتنی شہرت اور ناموری حاصل ہو جائے کہ اپنے ہم چشموں میں سے کسی سے کمتر نہ رہیں۔ چنانچہ خود اپنے ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں:

''آہ من کہ مرا زیان زدہ و سوختہ خرمن آفریدند۔ نہ بآئین نیاگان خویش سلطان سنجر دا رائے کلاہ و کمرے نہ بفرہنگ فرزانگاں بوعلی آسا علم و ہنرے۔ گفتم درویش باشم و آزادانہ راہ سپرم۔ ذوق سخن کہ ازلی آوردہ بود رہزنی کرد و مراں بداں فریفت کہ آئینہ زدودن صورت معنی نمودن نیز کار نمایاں است۔ سرلشکری و دانشوری خود نیست۔ صوفی گری بگزار و بسخن گستری روی آر۔ ناگزیر ہمچناں کردم و سفینہ در بحر شعر بگزار رواں کردم قلم علم شد و تیرہائے شکستہ آبا قلم۔'' (۸)

اپنے اس خیال کو کہ تیرہائے شکستہ آبا قلم بن گئے، انہوں نے ایک رباعی میں بھی نظم کیا ہے:

غالبؔ بہ گرزردودۂ زاد شمم ۔۔۔ زاں رو بصفای دم تیغست دمم

چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر ۔۔۔ شد تیرِ شکستۂ نیاگاں قلمم

غالبؔ نے شعر و سخن کے راستے کا انتخاب محض دوستوں کی ترغیب یا احباب کی تشویق پر نہیں کر لیا بلکہ انہوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کا اور اس وقت کی دہلی کے ماحول کا اچھی طرح جائزہ لے کر یہ فیصلہ کیا۔ یوں تو غالبؔ شادی سے پہلے بھی دہلی آیا جایا کرتے تھے لیکن جب شادی کے بعد دہلی آئے تو یہ وہ وقت تھا جب مرہٹوں کا زور ٹوٹ چکا تھا اور انگریزی نظم و نسق قائم ہو چکا تھا جس کے نتیجے میں دہلی اور دہلی کے اطراف امن و امان تھا اور ایک بار پھر یہاں کی مجلسی زندگی عود کر آئی تھی جس کے سبب علمی و ادبی سرگرمیوں کی گہما گہمی تھی۔ شہر کی آبادی میں اضافہ ہو گیا تھا اور علم و فن کا بکھرا ہوا شیرازہ دوبارہ بندھ گیا تھا۔ بقول حالیؔ کے ''دارالخلافہ دہلی میں چند ایسے باکمال جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتے تھے۔''

Scanned by CamScanner

صاحب آثار غالب نے اس دور کو انگلستان و مغرب کی دو مشہور و معروف تحریکوں Reformation اور Renaissance کے مماثل و متوازی قرار دیا ہے۔ انگلستان میں چھاپہ خانہ کی ابتدا سولھویں صدی میں ہوئی اور اس ہی کے باعث علم عام ہوا۔ دہلی میں بھی چھاپہ کا آغاز قریب قریب اسی دور میں ہوا اور اس نے اشاعت علم میں اہم کردار ادا کیا۔ نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم واقعہ انجیل کا انگریزی میں ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ کام شاہ ولی اللہ نے قرآن پاک کا پہلی بار فارسی میں ترجمہ کر کے کیا۔ Renaissance میں جس طرح عام ملکی زبانوں کی مقبولیت کو ترقی ملی بالکل اسی طرح ہندوستان میں یہ کام فارسی اور عربی کے مقابلے میں اردو نے کیا۔ دہلی کے علما و فضلا نے اردو کی ہمہ گیری کو محسوس کر کے اپنی توجہ اردو کی جانب مبذول کر دی اور اس ضمن میں شہرۂ آفاق اقدام شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین نے قرآن کا اردو میں ترجمہ کر کے کیا۔

یوں تو قرآن پاک کے فارسی اور اردو تراجم بھی اشاعت علم ہی کے اقدامات تھے لیکن عمومی تعلیم کی اشاعت اور عمومی درس و تدریس کی ترقی میں جو بے مثال بیدار مغزی اور صحیح قوت فیصلہ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے دکھائی اس کی مثال مشکل ہے۔ چنانچہ جب دہلی میں انگریزی سرکار نے دہلی کالج قائم کیا اور دہلی کے اکثر علما اور اکثر مسلمان امرا کو وہاں اپنی اولاد کی تدریس میں تامل ہوا تو شاہ صاحب نے بڑی شدومد سے وہاں تعلیم کے تحصیل کی حمایت کر کے مسلمانوں اور خصوصاً اونچے طبقے کے امرا کی ذہنی خلش کو دور کیا جس کے نتیجے میں اس فیض کے دریا نے آہستہ آہستہ بہنا اور تشنہ اطراف کو سیراب کرنا شروع کر دیا۔ دہلی کالج کا قیام علیگڑھ کالج سے پچاس سال پہلے عمل میں آیا۔ چونکہ سرسید خود یہاں زیر تعلیم رہے تو میرے خیال میں تو علیگڑھ کا سارا بلیو پرنٹ انہوں نے دہلی کالج ہی سے تیار کیا۔ دہلی کالج کے معیارِ تعلیم اور وہاں کے اساتذہ کے معیار علم کا اندازہ سرسید، ذکاء اللہ، حالی، نذیر احمد وغیرہم جیسے کاملان فن سے لگایا جا سکتا ہے جنہوں نے اس

Scanned by CamScanner

درسگاہ سے تحصیل علم کی۔

اس دور کی علمی سرگرمیوں کا منظر نامہ اس وقت تک مکمل نہی ہوتا جب تک کہ سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کی تحریک اصلاح دین کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس تحریک کو وہابی تحریک بھی کہا جاتا ہے اور سرسید نے اس کو مارٹن لوتھر کی Reformation کے مماثل قرار دیا ہے۔ یہ وہ تحریک تھی کہ جس میں اس دور کا ہر صاحب علم وفکر مسلمان اس کے حق میں یا اس کے خلاف شریک تھا۔ اور باوجود اس کے کہ عمومی طور پر شعرا کو دین اور دینی مسائل کی باریکیوں سے لاتعلق ہی گردانا جاتا ہے اس دور کے تمام اکابرین شعرا بھی کسی نہ کسی طرح اس تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ شاہ نصیر، مومن، غالب اپنے اپنے طور پر اس تحریک کے حق میں یا مخالف رائے ضرور رکھتے تھے۔ مقلدین میں مولوی فضل حق تھے اور غیر مقلدین میں شاہ اسمٰعیل اور سرسید احمد خان۔ مومنؔ خود سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ غالبؔ نے بھی ان مباحث میں ایک حد تک عملی حصہ لیا۔ چنانچہ اس تحریک سے متعلق جو اہم ترین بات ہے تو وہ یہ کہ غالبؔ کا نقطۂ نظر غیر تقلیدی تھا اور شاہ اسمٰعیل سے ہم آہنگ تھا۔ باوجود اس کے کہ ان کا ربط ضبط اور رسم و راہ مولوی فضل حق سے جو مقلدین کے سرگرم ترجمان تھے، بہت زیادہ تھی۔ صاحب آثار غالب نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جس طرح غالبؔ نے شاہ اسمٰعیل کو مذہب میں تقلید کے خلاف جہاد کرتے دیکھا اس نے ان کی طبعی آزاد خیالی کو اور بھی راسخ کر دیا اور اس ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے بھی فن لغت نویسی اور فن شعر گوئی میں استادوں پر آزادانہ نکتہ چینی کی اور کہا کہ ''اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں وہ سب صحیح نہیں۔ ہر پرانی لکیر صراط مستقیم نہیں ہوتی۔''(۹)

آگرے کے قیام میں معترضین کے طنز وطعن کی غالبؔ نے پروا نہ کی اور ان کو ''جاہل'' ہی تصور کرتے رہے۔ لیکن دہلی کے قیام میں اہل علم و صاحبان ذوق سے قریبی تعلق، ہم چشم باذوق احباب کی روک ٹوک، علم و ادب کے معیاری ماحول اور پھر فارسی شعرا کے باقاعدہ مطالعے نے انہیں اپنے اسلوب پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں

Scanned by CamScanner

ان کی وہ چھٹی حس جس نے ان کے آباؤاجداد کو زمانے کے سردوگرم میں زندگی کی راہ بتائی، یکا یک جاگ اٹھی اور چونکہ وہ جانتے تھے کہ میرے پاس زندہ رہنے کے لیے صرف متاع شعر وسخن ہی ہے، اور اس ماحول میں اگر اپنی انفرادیت برقرار رکھنی ہے، ہم چشموں کے شانہ بشانہ چلنا ہے اور اپنے مطلوبہ و انتخاب کردہ طبقے ہی میں زندگی گزارنی ہے تو اپنے اسلوب نگارش کو تبدیل کرنا ہوگا۔ ورنہ خود بیدل کی طرح فنا ہو جاؤ گے اور کہیں نشان باقیات نہ ملے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ آگاہی انہیں رفتہ رفتہ ہی ہوئی ہوگی اور یہ فیصلہ انہوں نے خواب میں کوئی بشارت پا کر نہیں کیا ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی میں انہوں نے اپنے اسلوب کے دفاع میں آگرے میں کہی گئی رباعی کو قدرے تبدیل کر دیا۔ یعنی

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ہوتے ہیں ملول اس کو سن کے جاہل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

اس کے دوسرے مصرع کو تبدیل کر کے ''سن سن کے سخنورانِ کامل'' کر دیا۔ اس تبدیلی سے یہ عندیہ بھی ملتا ہے کہ اب انہیں اپنے معترضین کی بات میں حقیقت اور سچائی بھی نظر آنے لگی اور ان کی نقد علم پر ان کا اعتماد بھی بحال ہو گیا۔ اور پھر وہ فارسی کلاسیکی شعرا کی پیروی کو بھی راست روی تصور کرنے لگے۔

ے ہرزہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار اے کہ در راہِ سخن جوں تو ہزار آمد ورفت

''گل رعنا'' میں شامل دیوان ریختہ کے متعلق آزاد (صاحب آبِ حیات) کا بیان ہے کہ یہ انتخاب مولانا فضل حق اور مرزا خانی کوتوال دہلی نے کیا۔ جب کہ مرزا کے اپنے بیانات اور معاصرانہ تذکروں سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ انتخاب خود غالب ہی نے کیا۔ یہ خیال بھی درست ہی ہوگا لیکن مرزا کی شاعری میں جو عظیم الشان تبدیلی ہوئی اس سے کسی خارجی رہنمائی یا دخل کو ہرگز خارج از امکان نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور بقول غالب انہوں نے اپنا طرز خاص اس لیے ترک کیا کہ اسے ''یاروں'' نے چلنے نہ دیا (جلوۂ خضر)۔ دراصل حقیقت وہی تھی جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ تین پشتوں کے تجربے نے انہوں بتا دیا

Scanned by CamScanner

تھا کہ ان حالات میں زندہ رہنے ہی کے نہیں بلکہ سربرآوردہ طور پر زندہ رہنے کا کیا طریقہ ہے۔ سو انہوں نے اپنی متاع شعروسخن کو اپنا واحد ہتھیار سمجھتے ہوئے اس سے وہی کام لیا جو احمد بخش خان نے اپنی دوعملی، انگریزوں سے سازباز اور اپنی دنیاداری چالاکی اور ہوشیاری سے لیا اور اس طرح نہ صرف یہ کہ اپنے دور میں طبقۂ امرا وخواص سے منسلک رہے بلکہ بادشاہ تک سے قرب خاص کے دعوے دار ہو گئے اور دنیائے شعروادب میں اپنے لیے ایسا پُرشان وشوکت ایوان تعمیر کیا کہ جس کی آب وتاب رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر پون کمار ورما کی رائے بھی دیکھ لیں کہ وہ اس تبدیلی کو کس نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی مشہور تصنیف ''غالبؔ، شخصیت اور عہد'' میں تحریر کرتے ہیں:

> ''تاہم آخرالامر ایسا لگتا ہے کہ اس وقت جب کہ وہ دنیائے شاعری میں نئے نئے متعارف ہو رہے تھے انہوں نے رائے عامہ کو خاطر میں نہ لانے کے اپنے رجحان کو حد سے زیادہ اہمیت دے کر اپنی ادبی پذیرائی کو خطرے میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ ایک مصافی مصالحت بھی تھی اور نکتہ چینوں کے طنز وتعریض کی ایک حد تک معقولیت کا بادل ناخواستہ اقرار بھی۔''(۱۰)

گویا انہیں زندہ وتابندہ رہنے کے لیے اور اپنی متاع ہنر کو فنا ہونے سے بچانے کے لیے یہ مصالحت لازمی تھی۔ سو وہ مصالحت انہوں نے بڑے شدومد سے کی اور جریدہ عالم پر اپنے لیے نقش دوام چھوڑ گئے۔ ہم چاہے اس کو ان کی ترقی پسندی سے تعبیر کریں یا بیدارمغزی سے، فراست سے یا ذکاوت سے حقیقت میں یہ ان کی وہی چھٹی حس تھی جو ان کو ان کے بزرگوں سے ورثہ میں ملی تھی اور جو عمومی طور پر تحفظ ذات کے لیے فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔

Scanned by CamScanner

''انشائے غالبؔ'' کے عنوان کے تحت صاحب آثار غالبؔ نے غالبؔ کی اس بیدار مغزی اور ترقی پسندی کا ایک اور بھی ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ انہوں نے تقریباً ۲۸ سال کی عمر میں اپنے عزیز دوست اور برادر نسبتی علی بخش خان کے لیے ان کی استدعا پر فارسی مکتوب نگاری پر جو مختصر رسالہ صرف تین دن میں تحریر کر کے مکتوب نگاری کا ایک انتہائی ترقی پسند دستورالعمل پیش کیا اس سے بھی ان کی ذہنی پختگی اور بیدار مغزی کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خط و کتابت کا جو نفیس اسلوب مرزا نے تیس برس بعد اردو زبان میں اختیار کیا اور جس سے ان کے اکثر فارسی خطوط عاری ہیں اس وقت بھی انہیں پسند خاطر تھا۔ یہاں ایک انتہائی معقول سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب غالبؔ نے اٹھائیس سال کی عمر میں خطوط نگاری کا ایک ترقی یافتہ دستورالعمل خود مرتب کر دیا تھا تو انہوں نے اس پر تیس سال تک عمل کیوں نہیں کیا۔ بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ بھرت پور کے محاصرے میں وہ جنرل کامبرمیر کے لشکر کے ساتھ اپنے سالے علی بخش خان اور چچا سر احمد بخش خان کی معیّت میں یہ دستور العمل مرتب کر رہے تھے اور ابھی اس دستورالعمل کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے سفر کلکتہ کے دوران اس دستورالعمل کی کھلی خلاف ورزی شروع کر دی اور یہ خلاف ورزی بہمہ شدومد آیندہ تیس سال تک جاری رہی تاوقتیکہ انہوں نے خود اردو میں مکتوب نگاری کا ایک نیا اسلوب جو سلاست بیان اور راست مدعا نگاری میں ان کے دستورالعمل سے ہم آہنگ تھا، اختیار نہیں کر لیا۔ اس سوال کا جواب چونکہ قدرے طویل اور زیر نظر مقالے کے محیط سے باہر ہے اس لیے فی الوقت اس سے صرف نظر کر کے ہم اپنی توجہ غالبؔ کی طبعی انفرادیت، ترقی پسندی، بیدار مغزی، حیات پرستی، فراست و ذکاوت تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت کی یہ خصوصیات ثابت کرتی ہیں کہ وہ ذہنی طور پر اپنے وقت سے بہت آگے تھے۔

اس ترقی پسندی کا پہلا مظہر تو ان کی انفرادیت اور جدت پسندی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لڑکپن میں ان کا رجحان ظہوری اور بیدل جیسے شعرا کی طرف تھا۔ اردو کی

Scanned by CamScanner

ابتدائی شاعری بھی اس انتہا کی تھی کہ فکری میدانوں کو پار کر کے خارجی دنیا پر بھی حاوی تھی۔ ان کی بول چال میں نشست و برخاست میں، لباس میں، کھانے پینے میں غرض یہ کہ ان کے اکثر خارجی رویے بھی عمومی رویوں سے بالکل مختلف تھے اور منفرد۔ وہ اس وقت پایاخ اوڑھا کرتے تھے جب کوئی دوسرا نہیں اوڑھتا تھا۔ وہ لنگی جو وہ سر پر باندھتے تھے وہ بھی عام دلّی والوں کی طرز سے مختلف ہوتی۔ انہوں نے اپنے چہرے کی ہیئت میں بھی دوسروں سے ہمیشہ امتیاز رکھا۔ یعنی جب داڑھی رکھی تو سر منڈوا دیا۔ انہوں نے سرسید کو اس وقت آئین اکبری کی تصحیح پر تقریظ لکھنے سے انکار کر دیا جب ان کے ذاتی تعلقات نہ صرف سرسید سے بلکہ ان کے خاندان سے نہایت گہرے تھے اور ان کے اس کام کو یک لخت مسترد کر دیا۔ اور مسترد صرف اس اصول پر کیا کہ انگریزوں کے بنائے ہوئے آئین وقوانین و ایجادات کے سامنے پچھلے سارے آئین تقویم پارینہ ہو چکے ہیں اور اس انکار پر لوگوں سے آفریں طلب ہوئے:

گر بدیں کارش نگویم آفریں　　جائے آں دارد کہ جویم آفریں

غالبؔ کی جدت پسندی کو مزید مہمیز ان کے سفر و قیام کلکتہ سے بھی ملا۔ وہاں انہوں نے ایک منظّم معاشرہ دیکھا۔ ڈاک و تار کا نظام دیکھا۔ دخانی جہاز دیکھے اور انگریزوں کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کو پورے زور وشور سے کام کرتے دیکھا۔ سرڈنکن نے ۱۷۹۱ء بنارس میں ہندو سنسکرت کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی۔ آگرہ کالج ۱۸۲۳ء میں قائم کیا گیا اور بعد میں بمبئی، بنگال اور مدراس تینوں پریزیڈنسیوں میں یونیورسٹیوں کی ابتدا ہوئی۔ ۱۸۲۴ء سے ۱۸۵۷ء دہلی کالج دانش جدید کا مرکز بن گیا۔ سی ایف اینڈریوز کہتے ہیں۔ ”کالج میں اردو، عربی اور فارسی ادب کے لیے ایک علیحدہ اورینٹل یعنی مشرقی شعبہ بھی تھا جس کو ۱۸۴۸ء تک اپنے نصاب کی جامعیت کے لحاظ سے انگریزی شعبے سے برابری کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ یہ شعبہ نہایت مقبول تھا اور جدید انگریزی علوم کی تحصیل کے لیے طلبا ان جماعتوں کو جہاں

Scanned by CamScanner

ذریعہ تعلیم اردو تھا چھوڑتے نہیں تھے۔ فارسی اور عربی میں طلبا کی جس معیار تک رہنمائی ہوتی تھی وہ بہت اونچا تھا۔ ممتاز مشاہیر ادب مثلاً نامور شاعر الطاف حسین حالؔی، اردو کے مسلم الثبوت نثر نگار نذیر احمد، عربی کے ممتاز فاضل مولوی ضیاء الدین، مورخ اور بے شمار تصانیف کے مترجم مولوی ذکاء اللہ اور ادبی تنقید کی کتاب آبِ حیات کے مصنف محمد حسین آزاد کا تعلق اسی مشرقی شعبے سے تھا۔ تعلیم جدید کی اس یلغار نے غالبؔ پر واضح کر دیا کہ اوّلاً فارسی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ دویم اسلوب نگارش میں اب سلاست کا دور آنا وقت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور قائم و دائم اور زندہ و پائندہ رہنے کے ابدی قانون کے مطابق انہوں نے اپنے مرتبہ دیوان سے دو ثلث نکال کر وقت کی ہدایت کو قبول کر لیا۔ چنانچہ کلکتے کے قیام کے دوران ان کے ایک عزیز دوست سراج الدین احمد کے ایما پر جن کا اخبار آئینہ سکندر سے بھی تعلق تھا اور جن کے نام غالبؔ کے بہت سے فارسی مکتوبات ہیں یہ انتخاب کلام اردو و فارسی عمل میں آیا اور اس انتخاب کا نام ''گل رعنا'' رکھا گیا۔ چونکہ اردو دیوان ان کے سفر کلکتہ سے پہلے ہی مرتب ہو چکا تھا اس لیے اردو انتخاب ردیف وار بھی ہے اور جن غزلوں سے لیا گیا ہے ان کی تعداد بھی زیادہ یعنی ۱۱۷ ہے۔ اس کے مقابلے میں فارسی کلام کا دائرہ بہت محدود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سفر کے زمانے تک انہیں فارسی میں شعر گوئی کی طرف توجہ زیادہ ہوئی ہی نہیں تھی۔''(۱۱)

آیئے اب غالبؔ کے دوسرے فیصلے کو دیکھتے ہیں۔ یعنی آغا میر سے ملاقات کو۔ مرزا جب لکھنؤ پہونچے تو وہاں غازی الدین حیدر بادشاہ تھے۔ اپنے والد نواب سعادت علی خان کی وفات کے پانچ سال بعد تک وہ نواب وزیر ہی کہلاتے رہے لیکن ۱۸۱۸ء میں لارڈ ہسٹنگز نے شاہ دہلی کی کسی بات سے بگڑ کر نظام حیدرآباد اور نواب وزیر اودھ کو بادشاہ کا خطاب اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ حضور نظام نے مغلیہ بادشاہ کے احترام کے خیال سے نہ مانا لیکن غازی الدین حیدر نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور ۱۸۱۹ء میں بڑی

Scanned by CamScanner

دھوم دھام سے ان کی تخت نشینی ہوئی جس کی ناسخ نے تاریخ کہی ''بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید''۔ ..... جب غالب لکھنؤ پہونچے تو بادشاہ کی خدمت میں باریابی کے لیے انہیں نائب السلطنت معتمد الدولہ آغا میر کی مدد کی ضرورت تھی جنہوں نے آغاز ملازمت خانساماں کی حیثیت سے کیا تھا لیکن نواب بیگم اور ریزیڈنٹ کی مدد سے بادشاہ پر اس قدر اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ اب وہ سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ جیسا کہ غالبؔ کے خطوں سے پتہ چلتا ہے ان کی نیابت تاریخ اودھ کا ایک نہایت تاریک باب ہے۔ مرزا نے ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ایک مدحیہ نثر صنعت تعطیل میں لکھی لیکن اس نثر کے پیش کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ملاقات کے لیے نائب نے جو شرطیں پیش کیں انہیں مرزا باعث شرم و خودداری سمجھتے تھے۔ چنانچہ خود اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ''آنچہ در باب ملازمت قرار یافت خلاف آئین خویش داری و ننگ شیوۂ خاکساری بود۔'' مرزا بقول خود اس وقت نو آموز شیوۂ گدائی تھے اور شاہان اودھ کی تعریف میں سب سے پہلا قصیدہ جو انہوں نے لکھا ہے اس میں بار بار اس امر کی طرف اشارہ ہے۔

ناز پروردہ خلوت گہ آزاد گیم　　کافرم گر بسرا پردۂ سلطاں رفتم
منم از خیل کریما نم و خجلت نبود　　گر بدریوزہ بدرگاہ کریماں رفتم (۱۲)

لیکن اس ضمن میں مالک رام حالیؔ کا حوالہ دیتے ہوئے ذکر غالبؔ میں یہ تحریر کرتے ہیں:

> ''میرزا آغا میر کی خدمت میں جانے کو تو راضی ہو گئے لیکن بقول حالیؔ انہوں نے اس کے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ اوّل میرے پہونچنے پر آغا میر میری تعظیم دیں یعنی اپنی جگہ کھڑے ہو کر پذیرائی کریں۔ دوم یہ کہ مجھے نقد نذر دینے سے معاف رکھا جائے۔ بلکہ غالبؔ یہ چاہتے تھے کہ آغا میر ان سے معانقہ بھی کریں۔ ''گدا طبع

Scanned by CamScanner

سلطان صورت'' آغا میر اعزاز واکرام کی اس حد تک جانے پر راضی نہ ہوا۔ ادھر مرزا اس سے کم کو آئین ''خویشتن داری'' کے خلاف اور شیوۂ خاکساری کے لیے ننگ خیال کرتے تھے اس لیے ملاقات نہ ہوسکی۔''(۱۳)

پون کمار ورما اپنی مشہور تصنیف ''غالبؔ، عہد اور شخصیت'' میں اس ملاقات کی بابت لکھتے ہیں۔''مربیوں کو بلتجی کی طرف سے شرطوں کا عائد کیا جانا اچھا نہیں لگتا۔ ایسا لگتا ہے کہ نواب سے ملاقات کی کوئی شکل نہ نکلنے کے بعد غالبؔ کو اس مہم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ یہ واقعہ غالبؔ کی زندگی میں سرپرستانہ امداد کے سرچشموں کی تعظیم وتکریم پر آمادہ کرنے والی ان کی مالی حالت اور ایک شاعر اور طبقۂ امرا کے رکن کی حیثیت سے اپنی قدر و قیمت پر ان کے اس یقین کلّی کے درمیان کشمکش کی بہت اچھی مثال پیش کرتا ہے جس کی رو سے غلامانہ ذہنیت کا کوئی بھی اظہار ان کے لیے باعث ذلت تھا۔ یہ کشمکش اکثر انہیں اظہار احترام میں جھکنے کے تمام مراحل سے گزارتی لیکن لمحۂ آخر میں وہ پھر سیدھے کھڑے ہو جاتے۔'' میرے خیال سے اس ملاقات کی ناکامی پر اس سے بہتر شرح نہیں ہو سکتی۔

اب آیئے غالبؔ کے آخری فیصلے پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس واقعے کے بارے میں صاحب یادگار غالبؔ تحریر کرتے ہیں:

''تذکرۂ آب حیات میں لکھا ہے کہ جب ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا مسٹر ٹامسن سکرٹری گورنمنٹ ہن مدرسین کے امتحان کے لیے دلّی آئے۔ اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار کا ایک عربی مدرّس کالج میں مقرر ہے اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے۔ لوگوں نے مرزا، مومن خان اور مولوی امام بخش کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا کو بلایا گیا۔ مرزا پالکی میں سوار ہو کر

Scanned by CamScanner

صاحب سیکرٹری کے ڈیرے پر پہونچے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی۔ انہوں نے فوراً بلا لیا۔ مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے مطابق صاحب سیکرٹری ان کے لینے کو آئیں گے۔ جب بہت دیر ہوگئی اور صاحب کو معلوم ہوگیا کہ اس سبب سے نہیں آئے تو وہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں آئیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہوسکتا۔ مرزا صاحب نے کہا گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا نے کہا مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے اور یہ کہہ کر چلے آئے۔'' (۱۴)

صاحب آثار غالب نے بھی یہ واقعہ من وعن اسی طرح نقل کیا ہے بجز اس کے کہ انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ غالبؔ ٹامسن سے ملنے کہاں پہونچے۔ یعنی وہ جگہ جہاں وہ ملنے گئے وہ ان کا دفتر تھا یا بقول حالیؔ ''سیکرٹری صاحب کا ڈیرہ''۔ البتہ مالک رام نے ذکر غالب میں اس واقعہ کا سنہ ۱۸۴۰ء لکھا ہے اور حاشیہ میں اس حقیقت کی صراحت بھی کی ہے کہ حالیؔ نے آزادؔ کا لکھا ہوا سال نقل کر دیا ہے جو غلط ہے۔ صحیح ۱۸۴۰ء ہی ہے جو ''مرحوم دہلی کالج'' میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔ اس بات کے علاوہ دوسری اہم بات یہ کہ انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ''یہ (مرزا غالبؔ) اگلے دن ان کے بنگلے پر پہونچے۔'' گویا وہ جگہ جہاں غالبؔ ان سے ملنے پہونچے وہ سیکرٹری ٹامسن کی اقامت گاہ تھی کالج کا دفتر نہ تھا۔ یہ تفصیل اس لیے ضروری ہے کہ دونوں جگہ پر استقبال و رخصت کے مختلف آداب ہیں۔ باقی تفصیلات دوسرے سوانح نگاروں کے ہاں بھی وہیں ہیں جو حالیؔ

Scanned by CamScanner

نے یادگارِ غالبؔ میں بیان کیں۔

ٹامسن کے رویے پر میرا ذاتی ردِعمل تو یہ ہے کہ اس کا رویہ دنیا کی مسلّمہ اور مہذب اقدار نشست و برخاست کے بالکل خلاف تھا اور وہ اس لیے کہ غالبؔ ان سے ملاقات کے لیے ان کی جائے اقامت پر گئے تھے۔ اگر وہ جگہ سرکاری دفتر ہوتی تب تو شاید ٹامسن کے رویے کا کوئی جواز نکلتا جب کہ اس صورت میں ہرگز نہیں نکلتا۔ مزید برآں میں یہ کہنا بھی پسند کروں گا کہ یہ صاحب لوگ جو ایک نئے معاشرے کی بنیادیں استوار کر رہے تھے، ایک زوال آشنا جاگیردارانہ معاشرے کی پرانی اقدار سے بھی آشنا تھے اور ان کو لندن سے ہندوستان آنے سے پیشتر زبان و ادب ہی نہیں سالوں یہاں کے ادب و آداب بھی سکھائے جاتے تھے، جب وہ یہاں کی سماجی اقدار سے کلیتًا واقف تھے تو ان کو غالبؔ کے علمی و ادبی مرتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ ساری رعایات دینی چاہیے تھیں جس کے وہ حقدار تھے۔ اب غالبؔ کی طرف سے دیکھا جائے تو ان کا فیصلہ سو فیصد درست تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اپنے معاشرے میں ایک نامور شاعر کی حیثیت سے تو وہ کسی مربی کی سرپرستی یا طبقہ امرا میں سے کسی کی کفالت تو قبول کر سکتے تھے لیکن کسی کالج میں ملازم ہو کر مدرسی کا تصور ہی چونکہ ناآشنا اور اجنبی تھا اس لیے اس کو تو وہ برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔

یہاں انتہائی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ آثارِ غالب کے ان الفاظ پر کہ جو انہوں نے اس واقعہ کے نفسیاتی تجزیے کے طور پر لکھے ہیں، اس مقالے کو ختم کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بعض لوگ حیران ہیں کہ مرزا جو عام مجسٹریٹوں اور معمولی متصدیوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے اور خوشامد و تعلّی کا کوئی پہلو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے وہ حکومت ہند کے ایک اعلیٰ عہدیدار کے استقبال نہ کرنے سے کیوں اس قدر

Scanned by CamScanner

چراغ پا ہو گئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا مدحیہ قصائد میں جو ایک طرح کا مبالغہ روا رکھتے اس کو وہ ایک شاعرانہ رسم سمجھتے تھے جسے شروع سے سب شاعر نباہتے آئے ہیں اور انگریز افسروں کی تعریف میں ان کے قصائد منظوم عرضیاں ہیں جنہیں زیادہ مؤثر بنانے کے لیے مرزا نے بجائے نثر کے نظم میں لکھا۔ وہ طبعًا خوددار و حساس تھے اور خاندانی اعزازات کی تو ایک ایک بات پر جان دیتے تھے۔''(۱۵)

اور اس لیے ہر وہ عمل جو ان کے معاشرتی منصب کی تنقیض کرتا ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

☆☆☆

Scanned by CamScanner

حوالہ جات

۱۔ غالب، کلیات نثر غالبؔ، ۱۲۸۷، مطبع نولکشور، ص ۶۰

۲۔ شیخ محمد اکرام، آثارِ غالب، ناشر شیخ نذیر احمد، محمد علی روڈ بمبئی، چوتھا ایڈیشن، ص ۵۷

۳۔ غالب، کلیات نثر غالبؔ، ۱۲۸۷، مطبع نولکشور، ص ۵۹

۴۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ، یادگارِ غالب، ادارۂ یادگارِ غالبؔ، کراچی، عکسی بازیافت ۱۹۹۷ء، فضلی پرنٹرز، کراچی، ص ۱۱۱

۵۔ نتالیا پری گاما، غالب، ص ۱۴۵، ۱۴۷

۶۔ حالیؔ، یادگارِ غالب، ص ۱۱۲

۷۔ شیخ محمد اکرام، آثارِ غالب، ص ۳۹

۸۔ غالب، کلیات نثر غالبؔ، ۱۲۸۷، مطبع نولکشور، ص ۴۱

۹۔ شیخ محمد اکرام، آثارِ غالب، ص ۵۱

۱۰۔ پون کمار ورما، غالب، شخصیت اور عہد، (ترجمہ: اسامہ فاروقی)، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد، نومبر ۱۹۹۹ء، ص ۱۱۹

۱۱۔ مالک رام، ذکرِ غالب، مکتبہ شعروادب، سمن آباد، لاہور، ص ۱۶۰

۱۲۔ شیخ محمد اکرام، آثارِ غالب، ص ۷۱

۱۳۔ مالک رام، ذکرِ غالب، ص ۶۱

۱۴۔ حالیؔ، یادگارِ غالب، ص ۲۹

۱۵۔ شیخ محمد اکرام، آثارِ غالب، ص ۹۸

Scanned by CamScanner